مدرسہ سلطانیہ

اودھ کی پہلی سرکاری امامیہ درسگاہ

فاضل نبیل ادیب العصر مولانا سید سبط محمد نقوی صاحب طاب ثراہ

چودھری سبط محمد نقوی صاحب مرحوم کا یہ مضمون ماہنامہ ''الواعظ'' میں جون ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کی افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے دوبارہ نذر قارئین کیا جارہا ہے۔ **(ادارہ)**

اس اتفاق کو کیا کہئے کہ جس زمانے میں انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی تعلیمی پالیسی کو قطعی شکل دی۔ وہ اودھ میں نصیرالدین حیدر شاہ (۱۸۲۷۔۳۷) کی حکومت کا زمانہ تھا۔ میکالے نے اس مسئلے پر اپنی تاریخی رپورٹ ۲ر فروری ۱۸۳۵ء کو پیش کی اور لارڈ ولیم بیٹنک گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے ۷ر مارچ ۱۸۳۵ء کے رزولیوشن کے ذریعہ اسے شرف قبولیت بخشا اور اس طرح تعلیم کے آزاد دھارے کو عیسائیت کی تبلیغ کی بالواسطہ جدوجہد کی طرف موڑ دیا۔ اگرچہ اس وقت تک اودھ بظاہر آزادی سے محروم نہ تھا پھر بھی حالات ایسے تھے جس میں انگریزوں کو اپنی تعلیمی پالیسی کی بجد خوانی کا موقع مل گیا۔ پہلا سبب تو یہ تھا کہ مرحوم نصیرالدین حیدر شاہ کے عہد میں اودھ پر قبضہ کر لینے کا سوال زیر غور تھا۔ آئینۂ تاریخ نما کا کہنا ہے کہ:۔

''تیس برس بعد لارڈ بیٹنک کو بخوبی معلوم ہوگیا کہ بے مداخلت کام نہ چلے گا کورٹ آف ڈائرکٹرس سے اجازت حاصل کر کے نصیرالدین حیدر کو دھمکایا کہ اب اختیار چھین کر پنشن مقرر ہو جائے گا۔'' (ص ۱۰۸)

اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ نصیرالدین حیدر شاہ کس دہشت کے عالم میں اوقات بسر کر رہے ہوں گے اور ان سے برطانوی مطالبات کی تعمیل و تکمیل میں کتنی سہولت رہی ہوگی۔ دوسری طرف بادشاہ بالطبع انگریزی طرز معاشرت کی طرف راغب تھے۔ اسی کے ساتھ ان کے والد بزرگوار غازی الدین حیدر شاہ کو وزارت کی شطرنجی سے اٹھا کر بساط شاہی پر بٹھا دینے کا احسان بھی تھا۔ دہشت، رغبت اور امتنان کی یہ ملی جلی فضا تھی جس میں اودھ کا سب سے پہلا انگریزی اسکول قائم ہوا۔ اودھ کے ہم عصر ہندوستانی تاریخ نگاروں کی جو ذہنیت یا ماموریت جو بھی رہی ہو اس کا پتہ اس سے چل سکتا ہے کہ اس قصے کو کمال الدین حیدر عرف میر محمد زائر حسنی الحسینی قیصر التواریخ میں کتنی مختصر لفظوں میں بیان کر کے کس شتابی سے فارغ ہوئے ہیں:

''............اسکول انگریزی طلباء اور

مشتاق زبان انگریزی کے واسطے بہ اہتمام
ریزیڈنٹ کیا.....'' (ج ا ص ۳۱۱)

یہ ایسے مؤرخ ہیں جو محل کے خلوت خانوں کی بات چیت کی پوری تفصیل جانتے ہیں کہ بادشاہ نے کس ملکہ پر کیا الزام لگایا، بادشاہ نے شاہ نادر پر کیا طنز کیا اور اس سلسلہ میں کیا گفت وشنید رہی۔ مگر تعلیم گاہ کے قیام کے سلسلہ میں مذکورہ الفاظ سے زیادہ ان کے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ میجر آر۔ ڈبلیو۔ برڈ نے اپنی مشہور کتاب میں جس کا ہندی ترجمہ محکمۂ اطلاعات یو۔پی۔ کی ہندی سمیتی نے ''اودھ کی لوٹ'' کے نام سے شائع کیا ہے یہ انکشاف کیا ہے کہ نصیرالدین حیدر شاہ نے لکھنؤ کالج کے طلباء کے لئے تین ہزار ماہوار وظیفے دیئے جانے کا بھی انتظام کردیا تھا۔ (ص ۵۴)

''اودھ انڈر واجد علی شاہ'' کے عنوان سے لکھے تحقیقی مقالے میں جواب کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر جے۔ڈی۔ بھٹناگر کا کہنا ہے کہ اس کالج کو عیسائی مشنریوں اور برٹش گورنمنٹ کی بھی معتد بہ اعانت حاصل تھی اور ۱۸۵۰ء میں اس کی لائبریری میں ۱۳۳۳ کتابیں اور ۱۸۵۱ء میں ۳۷ عیسائی ۶۶ ہندو اور ۷۴ مسلمان طلبہ زیر تعلیم تھے۔ (ص ۲۰۷) یہ درسگاہ لامارٹینیر کالج کے نام سے آج بھی جاری ہے اور مغرب زدہ خوشحال طبقے کی لکھنؤ میں ممتاز درسگاہ ہے۔ ۵۷ء کی جنگ آزادی کے سرکار مؤرخ کا کہنا ہے کہ سلطان عالم کے کتب خانے کی انگریزی کتابیں بھی اس کالج کو انگریزوں نے دے دی تھیں۔

برطانوی تعلیمی پالیسی کے پس پردہ ارادے اور منصوبے کیا تھے؟ اس کی جھلک پی۔سی۔ جوشی کی لفظوں میں ملاحظہ فرمائیں:

> انگریزی تعلیم کے اجرا کا سبب ہندوستان میں یوروپی سائنس کو رائج کرنے اور روشن خیال طبقہ پیدا کرنے کی نیک خواہش نہ تھی بلکہ اس کا سیدھا تعلق انگریزی تعلیم کے حامیوں میں نئے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے مقصد کے ساتھ تھا مثال کے طور پر ۱۲/اکتوبر ۱۸۳۶ء کو مکالے نے اپنی ماں کے نام ایک خط میں لکھا۔ میرا پختہ یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم کے منصوبے پر عمل کیا جائے تو بنگال میں تیس سال بعد ایک بھی بت پرست نہ رہے گا۔
>
> (انقلاب ۱۸۵۷ء، ص ۱۶۵)

یہ ارادے ایسے نہ تھے جو علماء کی فراست سے پوشیدہ رہتے۔ ان کو اس کا بخوبی ادراک تھا، اس کا تدارک ان کا مذہبی فریضہ بھی تھا، سماجی ذمہ داری بھی اور وہ اس سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔ مآخذ کے بآسانی دستیاب نہ ہوسکنے کے باعث یہ عرض کرنا تو فی الوقت ممکن نہیں ہے کہ غیرسرکاری سطح پر کسی منظم وباقاعدہ درسگاہ کا قیام عمل میں آیا یا نہیں لیکن اودھ کے دیندار ومتشرع بادشاہ امجد علی شاہ (۴۷۔۱۸۴۲ء) کے عہد میں سرکاری سطح پر ہم مدرسۂ سلطانیہ کی تاسیس پاتے ہیں۔ تاریخ کی ایسی صراحت نظر قاصر سے نہیں گزری ایسی کوئی تحریک نصیرالدین حیدر اور محمد

علی شاہ (۴۲۔۱۸۳۷ء) کے عہد میں ہوئی یا نہیں لیکن گمان ہے کہ نصیرالدین حیدر کے حالات دیکھتے ہوئے علماء کرام نے اس تحریک کی کامیابی کا امکان نہ دیکھا ہوگا۔ محمد علی شاہ مرحوم کو اپنے مختصر دور فرماں روائی میں انگریزوں کی باج گزاری، ان کے لئے چندۂ جنگ کی فراہمی کے بعد حسین آباد کے امام باڑے، جامع مسجد اور عوامی آسائش کی دوسری تعمیروں کے ساتھ مدرسہ کی تاسیس کا موقع نہ مل سکا ہوگا۔ امجد علی شاہ کے جلوس کے پہلے ہی سال میں تاسیس کا فرمان ہوجانے سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ وزیر اعظم امین الدولہ نواب امداد حسین خاں مرحوم کو آمادہ کیا جا چکا تھا اور دیر محض حکم شاہی کی تھی۔

اس واقعہ کو تاریخ نگاروں نے اتنا معمولی شمار کیا کہ کئی نے تو ذکر تک نہیں کیا۔ وزیر نامہ کے مصنف امیر علی اور بوستان اودھ کے مصنف کنور درگا پرشاد مہرؔ سندیلوی کے ایسے مغتنم مؤرخوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ محمد زائر حسنی الحسینی کے لئے چونکہ شاہان اودھ کی ہر حرکت وسکون پر اعتراض لازم تھا اس لئے انھوں نے اس میں بھی تنقیص کا پہلو ڈھونڈھ ہی لیا فرماتے ہیں:

"...........بعد اس کے بنائے مدرسۂ سلطانی ہوئی بہ تجویز واختیار مجتہدین۔ اس صورت خاص سے دوسو طلباء اور تیس مدرس خلاف دستور مدرسہ وکالج انگریزی جیسا کہ سب جانتے ہیں....."

مگر آل غفران مآب رحمھم اللّٰہ اور ان کے نامور شاگردوں کے حالات میں اس مدرسہ کا ذکر بہ کثرت آیا ہے مگر اس عہد کے طرز انشاء کے مطابق مناقب کی شان سے بیشتر تاریخ کی صورت میں کمتر۔ عہد شاہی کے تذکرہ نگاروں میں سب سے زیادہ وضاحت وتفصیل سید کاظم علی کی خودنوشت سوانح عمری میں ملتی ہے۔ امجد علی شاہ مرحوم کے ذکر میں کہتے ہیں:

"......واز جملہ رواج دین بنا کردن، مدرسہ باہتمام جناب قبلہ وکعبہ در مقبرۂ نواب جنت آرام گاہ کہ مکانے بود نہایت وسیع گردا گرد آں چہار طرف دالانہا وحجرہا بودند قریب سی مدرس کہ بعضے از آنہا از علمائے اعلام وفضلاء کاملین بودند مثل مولوی میر احمد علی صاحب ومفتی میر محمد عباس صاحب و شیخ علی اظہر صاحب و مولوی میر علی محمد ومولوی مرزا محمد علی صاحب ومولوی میر حامد حسین صاحب این صاحبان جامع معقول ومنقول وحاوی فروع واصول بودند دیگر مدرسین مثل آنہا کمالے نداشتند لیکن بنظر الطاف وعنایات قبلہ وکعبہ بہ عہدۂ مدرسی منسوب گردیدند۔ تنخواہ مدرسین کہ بدرجہ اعلیٰ بودند صد

روپیه یا هفتاد روپیه، در ماهه ودیگر مدرسین سی وچهل یا بست روپیه بود وماه بماه بدون تاخیر وصول می شد وتنخواه طلباء ومبتدیپن چهار روپیه ودر ماهه متوسطین شش روپیه ومنتهیپن نُهه روپیه معین بود همه کس از اهل مدرسه بهمواره مورد مراحم الطاف سلطانی بودندگاه گاه خود حضرت اقدس واعلیٰ بسواری هوا دار در مدرسه رونق افروز شده هر چهار طرف دوره میکردند وصدها خوان انواع طعام وشیرینی ومیوه که در تقریبات امراء ومهاجنان برا ے بادشاه می فرستند حکم می شد که باهل مدرسه تقسیم نمایند ودر آں ایام هرکسے را شوق درس وتدریس بحد کمال بود بسیارے از طلبه غیر ملازم برائے تحصیل علم در مدرسه آمدو شدمی نمودند۔"

(منقول از حیات رضوان مآبؒ مصنفہ مولانا سید علی اکبر، ص ۱۴)

میر صاحب نے بڑی وضاحت سے کام لیا پھر بھی یہ بات رہ گئی کہ اس مدرسہ کے مدرّس اعلیٰ جناب غفرانمآبؒ کے پوتے اور جناب سید العلماء علامہ سید حسین علیین مکانؒ (متوفی ۱۲۷۳ھ) کے صاحبزادے جناب ممتاز العلماء مولانا سید تقی صاحب قبلہ جنت مآبؒ (متوفی ۱۲۸۹ھ) معین ہوئے تھے اور ان جناب کو فخر المدرسین کا خطاب عطا ہوا تھا۔ عصر حاضر کے تاریخ نگاروں میں، جہاں تک راقم السطور کی نظر پہنچی ہے، سب سے زیادہ معلومات ڈاکٹر جے۔ ڈی۔ بھٹنا گر مہیّا کرتے ہیں جن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مدرسے پر چھبّیس سو روپیہ خرچ ہوتا تھا جس میں ایک سو پچیّس مبتدی طلاب پر پانچ سو پچاس متوسطین پر، تین سو اور تیس منتہی طلاب پر تین سو روپیہ ماہوار وظیفے میں صرف ہوتا تھا۔ چودہ ابتدائی مدرسین پر جو پندرہ سے تیس روپئے ماہور تک پاتے تھے تین سو پندرہ روپئے، درجات وسطانی کے سات اساتذہ پر چالیس روپئے کی شرح سے دو سو اسّی روپئے اور اعلیٰ درجات کے ۱۵/ اساتذہ پر ستّر روپئے کی شرح سے تین سو پچاس روپئے صرف ہوتے تھے۔ تین پرنسپلوں پر ڈیڑھ سو روپئے کے حساب سے چار سو پچاس روپئے تنخواہ میں صرف ہوتے تھے۔ دفتر کا عملہ چار افراد پر مشتمل تھا جن میں دس روپئے سے لے کر پچیس روپئے تک پانے والے تھے ان پر پینسٹھ روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ دو یا تین روپئے ماہوار کے معمولی ملازم تھے جن کی تعداد چودہ اور تنخواہ کی میزان چالیس روپئے ماہور تھی۔

ڈاکٹر بھٹنا گر ایک مسامحے کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ مدرسہ کی ابتدا امام باڑۂ آصف الدولہ میں ہوئی۔ یہ بات بحدِ تواتر ثابت ہے کہ ابتدا مقبرۂ نواب سعادت علی خاں مرحوم میں ہوئی اور سلطان عالم واجد علی شاہ (۵۶۔۱۸۴۷ء) کی مسند نشینی کے بعد مدرسہ امام باڑہ میں

منتقل ہوا۔ بچارے حسنی الحسینی نے اس منتقلی کو مٹ جانے سے تعبیر کیا ہے اور مرزا محمد ہادی عزیزؔ نے جناب مفتی علامہ کے اشتغال کی نسبت بھی ایک جگہ بہت مبہم فقرہ لکھ دیا ہے جس سے ان سطور کے راقم کو بھی غلط فہمی ہوئی۔ ان پر آگے چل کر نظر ڈالی جائے گی۔

اس مدرسے کی تاسیس سید العلماء علّامہ سید حسین علیین مکانؒ کی مساعی کا ثمرہ تھی۔ اس لئے جناب مرحوم کے سوانح میں اس کا تذکرہ بہت آیا ہے۔ آپ کے فخرِ استاد، شاگرد علامۂ مفتی میر محمد عباس (متوفی ۱۳۰۶ھ) نے آپ کے سوانح پر اوراق الذہب، مرتضیات حُسینیہ اور خصائص حسینیہ نامی تین کتابیں لکھی ہیں۔ ظل ممدود اور ریاحین الانشاء کے نام سے آپ کے مجموعہ مکاتیب ہیں۔ صاحبان نظر کا بیان ہے کہ ظل ممدود میں بہت سے حالات پائے جاتے ہیں۔

افسوس ہے کہ یہ سب کتابیں اب نوادر میں ہیں۔ بڑی جاں فشانی کے بعد مجھے ان میں سے کسی کتاب کے مطالعے کا شرف وفائدہ میسر نہ ہوسکا۔ ریاحین الانشاء پر ایک نظر ڈالنے کا موقع ضرور ملا۔ مگر کرفیو کی پابندی کی وجہ سے نوٹ لینے کا موقع نہ مل سکا۔ مگر اوراق الذہب کے طویل اقتباسات دوسری کتابوں میں دیکھنے کو ضرور ملے۔ اوراق الذہب کے "**المعدن السادس**" کو جس میں مدرسے کی تاسیس کا تذکرہ ہے مولانا سید احمد علامۂ ہندی نے اپنی تالیف "ورثۃ الانبیاء" میں نقل کیا ہے۔ اس کی ادبی شان کا کیا کہنا مگر تاریخی طرز کی کوئی کارآمد تفصیل نہیں ملتی مگر چونکہ جناب مفتی صاحبؒ کا اس درسگاہ سے بہت گہرا اور وسیع تعلق تھا اس لئے ان کے سوانح نگار مرزا محمد ہادی عزیزؔ مرحوم نے بڑی دلچسپی کے ساتھ متعدد مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ معلومات افزا بھی ہے۔ لیکن اس طرف متوجہ ہونے سے پہلے ایک واقعہ جناب مفتی صاحب کی پُرلطف نظم میں دیکھ لینا مفید بھی ہوگا اور دلچسپ بھی۔

بات یہ تھی کہ ایک مسافر طالب علم جو مفتی صاحب کے پڑوس میں رہتے تھے وظیفے سے محروم رہ گئے۔ جناب مفتی صاحب کے والد بزرگوار کو اس بات کا بڑا تاثر ہوا۔ اب آپ اس کی تفصیل "گوہر شاہوار" کے ان منتخب اشعار میں دیکھیں اور یہ بھی ملاحظہ کریں کہ جناب سید العلماء علیین مکان کا اعزاز واحترام ان کے باکمال ونادرۂ روزگار تلامذہ کی نظر میں کیا تھا:

ز طلاب مردے غریب الوطن
رسید از دیار خودش سوئے من
زمانے بمن داشت ہمسائیگی
بسر کر د در فقر و بے مائیگی
چو در عہد امجد علی بادشاہ
کز و رونقے یافت دینِ الٰہ
شد افزائش قدر ارباب علم
وظائف شد ازبہرِ طلاب علم
نوشتند بر رغم چرخ کہن
در آں زمرہ اسمائے اخوانِ من
قلم بود در دست مولائے دیں
سرِ دفتر اہل علم و یقیں

اما میکه در کشور اجتهاد
چو او مادر دہر ہرگز نه زاد
پرستار ہر فتنهٔ مبتلا
سمّی جگر تشنهٔ کربلا
قضارا نکرد آں امام الوریٰ
رقم اسمِ آں طالب العلم را
بمن گفت والد که بشتاب زود
بکن سعی وکوشش دریں باب زود
بر و پیش علامه سید حسین
بگو کاے بود طاعتت فرض عین
بکش بر سرِ نام اخوان قلم
بجایش بکن نام ایں کس رقم
من از جائے برخواستم قطره زن
رسیدم به نزد امامِ زمن
بگفتم باوآنچه باتست گفت
تلطف نمود وکلامم شفت
ہماں وقت نامش بدفتر فزود
بر اسمائے مرقومه اش بر فزود
ہنوز آں عزیز است برجائے خویش
خدایش نگه دار از درد ریش
پدر رفت ونیکی بجا ماند زد
بعالم دعاء و ثنا ماند زد
(ص۱۹)

آیئے اب ہم مفتی صاحب کے سوانح اورمرزا عزیزؔ مرحوم کی تحریر میں مدرسے کے تاریخی حالات کی جستجو کریں۔ مدرسۂ شاہی کے عنوان سے 'تجلیات کے حصہ اول پر رقم طراز ہیں:

''امجد علی شاہ کے جلوس کے شروع سال میں سید العلماءؒ نے بادشاہ موصوف کو مدرسۂ دینیہ کی طرف توجہ دلائی اور شروع ماہ صفر سے مدرسہ کے افتتاح کی بھی شہرت ہونے لگی۔ اس زمانے میں مفتی صاحب نے ایک مختصر رسالہ ترغیب بنائے مدرسہ میں تحریر کیا۔ اور ممتاز العلماء سید محمد تقی صاحب کے ذریعہ سے بادشاہ تک پہنچایا......انھوں نے فوراً توجہ فرمائی اور وزیر الممالک نواب امداد حسین خاں صاحب ذوالفقار جنگ اس کے انتظام کے لئے مامور ہوئے اجرائے مدرسہ کا حکم نافذ ہوتے ہی اس کا انتظام ہوگیا۔ ۲ / جمادی الاول ۱۲۵۹ھ کو جناب سلطان العلماء وسید العلماء مع اولاد واصحاب شہر کے تمام فضلا اور طلباء کو لے کر مہمانی سلطانی میں تشریف فرما ہوئے .... یہ دعوت نہایت پرتکلف تھی شہر کے گوشے گوشے میں اہل علم بادشاہ کی تعریف کے قصیدے پڑھ رہے تھے......''

یہاں پر یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ مرحوم امجد علی شاہ ۵ / ربیع الثانی ۱۲۵۸ھ کو تخت نشین ہوئے تھے۔

اس طرح ان کی حکومت کے چودھویں مہینے میں قائم ہوا۔
جناب مفتی صاحب نے واقعہ جس طرح اوراق الذہب میں تحریر فرمایا ہے عزیزؔ صاحب مرحوم کا بیان اس سے قدرے مختلف ہے گو نفس الامر کو گزند نہیں پہنچی پھر بھی صورت واقعہ کی تشخیص کے لئے مفتی صاحب کے ارشاد کو دیکھ لینا مفید ہوگا:

"...اَمَرَنِی بِجَمْعِ الْاَخبَارِ عَنِ الْاَئِمَّةِ الْکِرَامِ عَلَیْھِمُ السَّلَامُ تَدُلُّ عَلیٰ الرَّغْبَةِ فِیْهَا وَلَوْ بِالْاِلْتِزَامِ فَاَلَّفْتُ فِی ذَالِکَ رِسَالَةً عُجَالَةً فَبَعَثَ بِهَا اِلی الْاَمِیْرِ الْاَمِیْنِ اَدَامَ اِقْبَالَهُ وَلَمَّا اُطَّلَعَ عَلَیْهَا السُّلْطَانُ الْمَغْفُوْرُ اَمَرَ بِالْمَدْرَسَةِ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْاُمُوْرِ..."

یعنی مجھے (سید العلماءؒ نے) ائمہ کرام کے ان احادیث کو جن سے علم دین کی رغبت ثابت ہوتی ہے جمع کرنے کا حکم دیا چنانچہ میں نے اس مبحث میں ایک رسالہ تالیف کیا جو امین الدولہ کی خدمت میں پیش کیا گیا اور جب سلطان مغفور کو اس کی اطلاع ہوئی تو بنائے مدرسہ کا حکم دیا۔
جناب مفتی صاحب نے بنائے مدرسہ کی کئی تاریخیں نظم کیں۔ ایک قطعہ کے چند شعر اور تاریخ کے مصرعے یہ ہیں:

شاہ زریں کمر و تاجور مہر نظر
کہ بعہدش شدہ در سیم و گہر ارزانی
ہر کہ از فقر تہی داشت کفے چون صدفے
درفشاں گشت کنوں چون سُحُبِ نیسانی
جولاں گاہ سمندش رہ شرع نبوی
سقف ایوان بلندش کرم یزدانی
گر بہ بلبل رسد از برگ گلے خار جفا
شود آن برگ گلاب از غضب سلطانی
شد بنا مدرسۂ عمدہ ز حکمش کہ از ان
رونقے تازہ گرفت انجمن ایمانی
دستہ دستہ علماء و فضلاء وصلحا
مثل گلدستہ فراہم شدہ در مہمانی
از سر جَودت واقبال دو مصرع گفتم
کہ بتاریخ بود ہر یک ازاں لاثانی
بیت معمور ہدیٰ مدرسۂ سلطانی
۹ ۵ ۲ ۱ ھ
نزہہ گاہ کملا مدرسہ خاقانی
۹ ۵ ۲ ۱ ھ

عزیز مرحوم پھر فرماتے ہیں:
"نواب سعادت علی خاں کے مقبرے میں اس مدرسہ کا آغاز ہوا اور سید العلماء کی تجویز سے مدرسین کا انتخاب ہوا۔ شہر کے منتخب فضلا عہدۂ مدرّسی سے سرفراز کئے گئے۔ مفتی صاحب کے متعلق بھی عہدۂ مدرسی ہوا............ مدرسۂ شاہی میں ایک مکان اور دس حجرہ مفتی صاحب کے زیر اہتمام تھے۔ چونکہ طبیعت میں جودت اور مزاج میں ظرافت تھی جو حجرہ جس کے

پاس تھا یعنی جس طرح تقسیم کیا گیا تھا اسی
طرح نظم بھی کیا......''

جو مکان اپنے والد سید علی اکبر مرحوم کو دیا تھا۔ جو مدرسے سے کسی حیثیت سے متعلق تھے۔ اس کے لئے فرماتے ہیں:

این مکان کز دیدہ ودل انور است
خاصۂ سید علیِّ اکبر است

باقی حجروں میں جناب مفتی صاحب کے بھائیوں کا قیام تھا۔ مفتی صاحب چھ بھائی تھے جو سب کے سب اپنے والد بزرگوار کے ساتھ مدرسہ میں مقیم وملازم تھے۔ تین چار حجرے دوسرے حضرات طلاب کے استعمال میں تھے۔

عرض کیا جاچکا ہے کہ عزیزؔ مرحوم کے ایک مبہم فقرے سے راقم السطور غلط فہمی کا شکار ہوا۔ وہ ''تجلیات حصہ اول'' کے صفحہ ۸۲ پر ہے:

''مدرسہ کا اشتغال تقریباً تین سال رہا ۱۲۶۲ھ میں سلطان واجد علی شاہ کے جلوس کے موقع پر مدرسہ مقبرۂ نواب سعادت علی خاں سے آصف الدولہ بہادر کے امام باڑہ میں منتقل ہوا اور یہ پاکیزہ مجمع متفرق ہوگیا۔''

اس سے میں نے یہ نتیجہ نکالا اور اپنے ایک سابق معروضے میں ظاہر بھی کیا کہ اس کے بعد مفتی صاحب کا تعلق مدرسے سے نہیں رہ گیا اور وہ مفتی وزارت کے فرائض انجام دینے لگے۔ یہ بات خلاف واقع ہے۔ غالباً عزیز مرحوم نے مدرسہ کی لفظ دارالاقامہ کے معنی میں استعمال کی، جیسا کہ حوزۂ علمیہ نجف اشرف میں اب تک مستعمل ہے۔ یا یہ ہوسکتا ہے کہ مرحوم کی مراد یہ ہو کہ مدرسہ کے انتظامی امور سے مفتی صاحب کا تعلق نہیں رہ گیا تھا۔ کیونکہ یہ بات خود ان کے بیانات سے ثابت ہے کہ مقبرے سے آصفی اماماڑے میں مدرسے کے اور مفتی صاحب کے شہر میں منتقل ہونے کے بعد بھی مفتی صاحب مدرسے سے متعلق رہے۔ جناب سید العلماء اور مفتی صاحب کے نظام الاوقات کے ذکر میں لکھتے ہیں:

''شاہی توپ خانہ سے صبح کاذب کی توپ بہت ہی سویرے چلتی تھی اور چھاؤنی کی توپ طلوع صبح صادق بلکہ طلوع آفتاب پر سَر ہوتی تھی۔ لیکن سید العلماء نماز صبح اول طلوع فجر بغیر انتظار ان علامت کے ادا کر چکتے تھے اور بعد اوراد ووظائف سائلین ومحتاجین کا اجرائے کار کر کے بفراغت تمام مسجد سے دولت سرا تشریف لاتے تھے۔ مشغلۂ درس وتدریس اور لوگوں کا ایک ہجوم رہتا تھا۔ مفتی صاحب اور ممتاز العلماء سید محمد تقی صاحب (فرزند سید العلماء) حاضر حضوری رہتے تھے۔ مفتی صاحب پڑھ کر اپنے مکان جاتے تھے اور ایک گھنٹہ بیٹھ کر مدرسہ سوار ہوجاتے

تھے...... ۲ بجے تک پھر مسجد نواب حسن
رضا صاحب میں نماز ظہرین سید العلماء
کے ہمراہ پڑھ کر پھر مکان تشریف لاتے
تھے چند ساعت تفریح طبع واصلاح حال
اولاد واعزا کی جانب متوجہ ہوکر وزارت کی
کچہری کا عزم کرتے تھے۔''

اگر اس بیان پر معمولی فکر وتامل سے کام لیں تو بین طور پر یہ نتیجے ہاتھ لگتے ہیں کہ مدرسہ اور کچہری وزارت میں مفتی صاحب کی فیض رسانی بیک وقت جاری تھی اور مدرسہ عہد سلطان عالم واجد علی شاہ میں جاری تھا۔ کیونکہ مفتی کا تعلق وزارت کے دار الافتاء سے واجد علی شاہ کے ہی عہد میں ہوا۔ ان شواہد کے علاوہ دوسرے ثبوت بھی ہیں جو کمال الدین حیدر حسنی الحسینی کے اس اختراع کا پردہ فاش کرتے ہیں کہ:

''............اسی طرح مدرسۂ سلطانی کا حال
ہوا۔ حضرت خلد منزل (یعنی امجد علی شاہ)
کے عہد دولت میں ہزار لڑکا داخل مدرسہ ہوا
تھا۔ فی پانچ روپئے تنخواہ اور بیس لڑکوں
میں ایک مدرس تھا سالہا سال کے بعد وہ
مٹ گیا۔''

(قیصر التواریخ، ج ۱ ص ۳۷۲)

ابھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ حسنی الحسینی کو اس بات کا بڑا اعتراض تھا کہ دوسو طلباء کے لئے تیس مدرس انگریزی درسگاہوں کے خلاف دستور مقرر کئے گئے۔ اب ہمدرد بن کر بیس طلباء پر ایک مدرس کے حساب سے مدرسوں کی تعداد پچاس کردی۔ جسے غالباً کسی اور نے بیان نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر بھٹناگر جنھوں نے عہد شاہی کے دستاویزات کا مطالعہ کیا ہے مدرسین کی تعداد ۲۹ اور طلاب کی ۲۵۰ بتاتے ہیں۔ میر کاظم علی نے اساتذہ کی تعداد ۳۰ بتائی ہے مگر طلاب کی تعداد معین نہیں کی ہے۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ ۲۵۰ وظیفہ دار تھے۔ غیر وظیفہ دار بھی کچھ رہے ہوں گے تو کتنے! اتنے ہی اور سہی۔ یہ ہزار کہاں سے آ گئے۔ ڈاکٹر بھٹناگر کے بیانات ۱۸۵۶ء کے کاغذات پر مبنی ہیں۔ جو شاہِ مظلوم کی معزولی وجلاء وطنی کا سال ہے تو یہ ہزار طلاب کب تھے۔ ایسے ہی بے سروپا الزامات انگریزوں نے اپنے جور وستم کے لئے تر شوائے ہیں۔ یہ مدرسہ عہد واجدی میں مٹایا قبضہ گیر برطانوی حکومت نے بند کیا؟ اس سوال کا بھی واضح اور قطعی جواب ڈاکٹر بھٹناگر نے دیا ہے کہ:

''اس کالج کو بعد میں برطانوی حکومت
نے الحاق کے بعد بند کردیا اور مدرسین
وملازمین کو پنشن دے دی۔''

(اودھ انڈر واجد علی شاہ، ص ۲۰۷)

پنشن کا واقعہ صاحبِ تجلیات نے بھی قلم بند کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''............مدرسہ سلطانیہ کے مدرسین کے
لئے بھی پنشن قرار پائی۔ جناب مولوی احمد
علی صاحب نے بھی پنشن قبول کی جناب
مفتی صاحب نے مطلقاً سعی وکوشش بلکہ

توجہ بھی نہ کی...... بلکہ بعض حکام نے بلایا
اور مقرر کرنا چاہا لیکن...... قبول نہ فرمایا بلکہ
جدید حکام کے پاس جانا بھی پسند نہ کیا۔
احباب ومخلصین نے فہمائش بھی کی لیکن
اس پر بھی التفات نہ فرمایا......''

پنشن کا اجرا اس بات کا بجائے خود ثبوت ہے کہ درسگاہ کو پنشن دینے والوں نے بند کیا۔ واجد علی شاہ نے نہیں مٹایا۔

اس محل پر یہ دیکھ لینا مفید ہوگا کہ مدرسہ کو مقبرے سے امام باڑے میں منتقل کرنے کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔ میں نے نہیں پایا کہ کسی مؤرخ نے اس بات کی صراحت کی ہو مگر قرائن بتاتے ہیں کہ اس کی وجہ قیصر باغ کی تعمیر اور وہاں قیام شاہی کا منصوبہ تھا۔ سلطان عالم کو فنون لطیفہ سے جو دلچسپی تھی۔ اہل مدرسہ کے لئے وہ منہیات شرعیہ تھے، قیصر باغ کو ان کا مرکز بننا تھا اور وہ بنا بھی ایسی صورت میں علم دین اور علماء کا احترام اس کا مقتضی تھا کہ مدرسہ کہیں اور منتقل کر دیا جائے اور بہترین بدل مہیا کیا گیا۔ کیونکہ آصفی امام باڑے میں مدرسہ، اسپتال اور مسافر خانے وغیرہ کے لئے پہلے سے ہی عمارتیں موجود تھیں۔ جب تک واجد علی شاہ رہے مدرسہ بھی رہا اور امام باڑہ بھی رہا۔ بادشاہ تخت وتاج سے محروم ہوئے تو تب مدرسہ بند ہوا اور امام باڑہ انگریزوں کی فوجی چھاونی میں بدل گیا۔ لکھنؤ کی یادگاریں مٹیا برج میں قائم کرنے کی کوشش پر بعد میں نظر ڈالیں گے۔ آیئے پہلے لکھنؤ کے امام باڑوں کا حال زار دیکھ لیں۔ یہ داستان عبرت ڈاکٹر نیر مسعود رضوی کی زبانی سنیں:

''عہد شاہی میں لکھنؤ امام باڑوں سے چھلک رہا ہے اور ہر امام باڑہ بہتر سے بہتر سامان سے مالا مال ہے۔ ہر امام باڑہ زندہ اور سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن اس کے بعد ۱۸۵۷ء کی خونی آندھی آ گئی۔ اس قیامت صغریٰ میں پورا شہر کسی جاں بلب زخمی کی طرح سسک رہا ہے فوجیں اس کے سینے پر سے گذر رہی ہیں اور امام باڑے شہر سے باہر نہیں ہیں۔ آصف الدولہ کے امام باڑے کو انگریزوں نے اپنا قلعہ بنا لیا ہے۔ امام باڑے کے پھاٹک برابر کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ امام باڑے کے چاروں طرف مٹی کے تودے لگا دیئے گئے ہیں۔ امام باڑے کی چھت اور مسجد آصفی کے میناروں سے گولیوں کی بوچھار ہو رہی ہے۔ سارے امام باڑے میں بارود کی بو پھیلی ہوئی ہے اور ہر دھاکہ کے ساتھ جھاڑ فانوس ٹوٹ رہے ہیں۔ قلعہ مچھّی بھون کو اُڑایا جا رہا ہے تو بہت دور پر مرزا کیواں جاہ کے امام باڑے کے فانوس لرزنے لگتے ہیں اور آصفی امام باڑہ مچھّی بھون کے حدود ہی میں ہے............ قدسیہ محل اور مظفر الدولہ کے امام باڑوں پر

انگریز قابض ہیں۔قیصر باغ میں قصر العزا
بھی انگریزوں کے قبضے میں ہے۔''

(نظامی جنتری، ۱۹۷۶ء ص ۱۳)

آیئے اب آصفی امام باڑے پر اس قبضے کی اور واگذاری کی حالت دیکھیں۔مولانا آغا مہدی صاحب کا بیان ہے:

''غدر کے بعد سے امام باڑہ آصف الدولہ اور مسجد انگریز فوجوں کا قلعہ قرار دی گئی تھی اور ٹیلہ کی مسجد ملیٹری کی ڈسپنسری تھی۔لکھنؤ کے مجتہد اعظم سید العلماء مولانا سید ابراہیم صاحب قبلہ کا حساس دماغ اس کو کیونکر گوارا کرسکتا تھا۔حکام شہر سے گفتگو کرکے انتھک کوشش کے بعد آپ نے امام باڑہ کو واگذار کیا اور ۲۰رجون ۱۸۸۴ءکو یہ عظیم الشان عمارت جناب کی نگرانی میں آئی اور ۲۴رجولائی ۱۸۸۴ءکو آپ نے مسجد آصفی میں نماز عید پڑھائی۔ٹیلہ کی مسجد میں اس سے پہلے بھی حضرات اہلسنت نماز پڑھتے تھے۔ وہ مسجد سنّی حضرات کے لئے تجویز کی۔ عیدین اور جمعہ کے سنّی شیعہ اجتماعات اب بھی انھیں دو مسجدوں میں ممتاز طور پر ہوتے ہیں۔آخر میں شیعہ مجتہد نے دنیا کے سب سے بڑے امام باڑہ اور ممتاز مسجد کو وقف حسین آباد کے سپرد کردیا۔''

(تاریخ شیعہ کا خونچکاں ورق، ص ۹۰)

کہنے کو مسجد واگذار ہوگئی۔قبلہ وکعبہ نے اقامت عید بھی کردی لیکن مصیبت ہے کہ ابھی ٹلنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔مولوی سید احمد علامۂ ہندی کا بیان ہے:

''بعد واگذار ہونے مسجد کے گورے اور انگریز چھاؤنی سے برابر کتے ہمراہ لئے مسجد کے اندر داخل ہوتے تھے۔مسجد کے حوض میں کتے ڈالتے تھے پھر کسی باہمت کا دل نہ دکھا انھیں جناب (سید ابراہیم صاحبؒ) نے یہ فکر کی صاحب کمشنر بہادر سے ملاقات کی اور اپنے امام باڑے میں دعوت دی۔ صاحب بہادر وقت معینہ پر ملاقات کو آئے............اسی دوران میں حال زار مسجد آصفی آں جناب نے بیان کیا صاحب خلیق ومہربان تھے فوراً وعدہ کیا کہ اندر مسجد کے اب کوئی فوجی شخص داخل نہ ہوگا۔ رخصت ہوئے دوسرے روز ایک حکم امتناعی لکھ کر جناب مرحوم کو بھیج دیا۔۔۔۔شیشے کے چوکھٹے میں چٹھی لگا کر چبوترہ کے پاس مسجد کے لٹکوادی اس روز سے حسب عادت جب انگریز مسجد میں آنا چاہتے تھے اس حکم کو دیکھ کر الٹے پیر واپس جاتے تھے۔'' (حیات فردوس مکاں، ص ۵۰)

جب صورت حال یہ ہوتو پھر کیسا مدرسہ اور کہاں کے علماء وطلاب لیکن اس کی تلافی مافات اور بدل کی کوششیں لکھنؤ میں بھی جاری رہیں اور مٹیابرج میں بھی۔ جناب سیدالعلماء طاب ثراہ کا انتقال تو الحاق سلطنت کے چھ سات مہینہ کے اندر ہوگیا تھا لیکن جناب مولانا سید ابوالحسن عرف جناب ابّو صاحب قبلہ طاب ثراہ کی سرگرمیاں اور ان کی حمایت میں جناب مرحوم کے خسر محترم مولانا سید تقی صاحب ممتاز العلماء طاب ثراہ کی مساعی نظر آنے لگتی ہیں۔ چنانچہ جناب مرحوم کی حمایت اور جناب مولانا سید غلام حسنین صاحب علامۂ کنتوری اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے تعاون سے ۱۲۸۹ھ میں جسے ۱۸۷۳ء کے مطابق سمجھنا چاہئے۔ یعنی امام باڑہ آصف الدولہ کی واگذاری کے گیارہ سال پہلے مدرسۂ ایمانیہ قائم ہوا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں مذہب حقۂ امامیہ کی دو اور دینی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ ایک مدرسۂ مشارع الشرائع جو اَب اپنے بانی خانبہادر مرزا محمد عباس مرحوم کے والد مرحوم ناظم صاحب کے نام کی مناسبت سے ناظمیّہ عربی کالج کے نام سے معروف ہے اور اپنے فعال و باعمل نوجوان پرنسپل مولانا حمیدالحسن یادگار نجم العلماء کی سرکردگی میں کامیابی کے ساتھ جاری ہے۔ اس مدرسہ کی تاسیس کے سلسلہ میں جناب عزیزؔ مرحوم نے جنھوں نے اپنی زبردست تصنیف جناب نجم العلماء طاب ثراہ کی رہنمائی اور نگرانی میں کی، اظہار کیا ہے کہ جناب ابّو صاحب قبلہ طاب ثراہ نے:

''اس کے بعد ''مشارع الشرائع'' مرزا محمد عباس علی خاں صاحب کو ترغیب دلا کر جاری کرایا جس کے فیوض سے اب تک ہندوستان مالا مال ہے جس کے شرف کو کافی ہے کہ جناب نجم العلماء اس کے مدرس اعلیٰ ہیں۔'' (تجلیات حصہ دوم، ص ۲۷۳)

اسے سوء اتفاق ہی سمجھنا چاہئے کہ عزیزؔ مرحوم نے مدرسہ کا سال تاسیس ذکر نہیں فرمایا۔ غالباً التفات نہ رہا ہوگا اور اس کے سال تاسیس کے بارے میں کئی روایتیں ہیں۔ لکھنؤ گزیٹیر کی تازہ اشاعت میں ۱۸۸۹ء بتایا گیا ہے۔ مدرسہ کے ارباب انتظام کے ایک حالیہ اشتہار میں ۱۸۹۲ء بتایا گیا ہے لیکن مدرسہ کی ایک سابق رپورٹ میں جو جناب مفتی احمد علی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے دور زعامت میں شائع ہوئی سال تاسیس ۱۸۹۰ء مذکور ہے اور یہی قابل وثوق بھی ہے۔

اسی دور میں امیر الدولہ راجہ امیر حسن خاں مرحوم والی محمود آباد نے بھی ایک دینی درسگاہ کی بنا کی۔ جس کے مدرس اعلیٰ اپنے دور کے یگانۂ روزگار معقولی اور مجتہد مولانا سید ظہور الحسن صاحب (متوفی ۱۳۵۷ھ) تھے۔ یہ درسگاہ بعد میں انگریزی اسکول میں تبدیل ہوگئی اور اب بھی امیر الدولہ اسلامیہ کالج کے نام سے قائم ہے۔ اسے مسلمانان لکھنؤ کو ریاست محمود آباد کا تحفہ سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ بظاہر اب روساء محمود آباد کا کوئی خاص تعلق اس ادارے سے باقی نہیں ہے۔

لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا مدرسہ سلطانیہ کی بحالی کے لئے فضا ہموار ہوتی گئی۔ جب وقف حسین آباد کے

سکریٹری کے منصب پر نواب راحت علی خاں مرادآبادی کا تقرر ہوا تو جناب ابّو صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی مساعی برگ وبار لائیں اور ۳۴ برس کے اندوہناک تعطل کے بعد جناب مرحوم کی زعامت میں یکم جولائی ۱۸۹۲ء کو مدرسہ کا احیا ہوا۔ اور جب مرزا مہدی حسین خاں صاحب عرف آغا ابوصاحب حسین آباد کے متولی ہوئے جو انگریزوں کے معتمد اور نہایت حکام رس ہونے کے باعث خاص اثر ورسوخ کے مالک تھے تو مدرسہ کی ترقی کو پر پرواز مل گئے اور ۱۹۲۲ء میں اپنی شاندار عمارت میں منتقل ہوا۔

دَورِ شاہی کی اس یادگار درسگاہ سے انگریزوں کو کس قدر وحشت رہی ہوگی کہ ۱۹۰۵ء میں آغا ابوصاحب مرحوم کو حکام کے سامنے یہ خیرخواہانہ نظریہ پیش کرنا پڑا کہ:

"مذہبی تعلیم انسان کو اکابر اور فرماں
روایان وقت کا مطیع وخیرخواہ رکھتی ہے
اور بغاوت وفسادات کے خیالات صرف
جہلاء کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔"

زندگی نے جناب ابوصاحب قبلہ کو اس مدرسہ کی خدمت کا موقع تین ہی سال دیا۔ ۱۸۹۵ء میں آپ نے رحلت فرمائی۔ اس کے بعد آپ کے نامور صاحبزدگان جناب مولانا سید محمد باقر صاحب باقر العلوم (متوفی ۱۳۴۶ھ) اور جناب مولانا سید ہادی صاحب (متوفی ۱۳۵۷ھ) اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے اس حدیقہ علوم اہلبیتؑ کی آبیاری کی اور یہ سلسلہ ان کی اولاد امجاد میں آج بھی جناب استاذی المحترم مولانا سید علی صاحب جامعہ سلطانیہ کے شیخ الجامعہ اور جناب مولانا سید محمد صالح صاحب مدرسہ سلطان المدارس کے مدرس اعلیٰ ہیں۔ اور مدرسہ کے تحفظ اور دفاع کی فکروں کے درمیان اس کی ترقی کے لئے سرگرم کار ہیں۔ اس ادارے کی، پرنسپل کے طور پر جناب نجم العلماء نے ایک مختصر مدت تک نگرانی کی ہے۔

تاسیس مدارس کے ذوق وجہاد کے باعث جناب ابوصاحب قبلہ کا شمار ان تمام مدارس کے بانی کی حیثیت سے ہونے لگا تھا اور یہ شہرت عامہ وا کابر اجلّۂ علماء تک تھی۔

الشیخ آغا بزرگ طہرانی اعلام الشیعہ میں فرماتے ہیں:

"اَلسَّیدُ ابوالحسن قُدِّسَ سِرُّہٗ
عَالِمٌ کَبِیرٌ وَفَقِیہٌ جَلِیلٌ لَہٗ مَسَاعٍ
مَشْکُوْرَۃٌ وَاٰثَارٌ خَالِدَۃٌ مِنْھَا تَاسِیسُ
الْمَدَارِسِ۔"

یعنی جناب سید ابوالحسن ایک عالم کبیر وفقیہ جلیل
تھے جن کی بہت سی مشہور مساعی اور آثار جاوید
میں دینی مدرسوں کی تاسیس بھی ہے۔

اسی طرح الشیخ محمد حسن المظفر تاریخ الشیعہ میں فرماتے ہیں:

"اَمَّا الْمَدْرَسۃُ النَّاظِمِیۃُ فَقَدْ اَسَّسَھَا
الْعَلَّامَۃُ السَّیِّدُ ابو الحَسَنِ قُدِّسَ سِرُّہٗ
کَمَا اَسَّسَ الْجَامِعَۃَ السُّلْطَانِیۃَ وَکَانَ
مِنْ اَکْبَرِ عُلَمَاءِ الْھِنْدِ فَضْلاً وَوَرَعاً

وَاَنَّ الْجَامِعَةَ السُّلْطَانِيَّةَ جَامِعَةٌ عَرَبِيَّةٌ وَحِيدَةٌ فِيْ شَانِهَا فِي الْهِنْدِ وَمَافِي اَقْطَارِ الْهِنْدِ مُبَلِّغٌ اَوْ وَاعِظٌ اَوْ عَالِمٌ لَهُ حَظٌّ مِنَ الْعُلُوْمِ الدِّيْنِيَّةِ اِلَّا وَيَنْتَسِبُ اِلَيْهَا۔"

یعنی مدرسہ ناظمیہ کی تاسیس علامہ ابوالحسن قدس سرہٗ نے کی ہے جیسے آپ نے جامعہ سلطانیہ کی تاسیس فرمائی۔ آپ فضل وورع کے اعتبار سے ہندوستان کے بزرگ علماء میں تھے۔ جامعہ سلطانیہ اپنی شان کے اعتبار سے ہندوستان کی واحد درسگاہ ہے۔ دیار ہند میں جو بھی ایسا واعظ، عالم یا مبلغ ہے جسے علوم دینیہ میں کچھ بھی بہرہ ہے وہ اسی جامعہ کی طرف نسبت رکھتا ہے۔

اگر دَلِيلُ الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ کے کوئی معنی ہیں تو اس نسبت تاسیس میں کیا شک ہوسکتا ہے:

اب ذرا مٹیا برج کی کیفیت بھی دیکھ لی جائے۔ وہاں سلطان عالم ایک نیا لکھنؤ بسانے کی سعی بحدِ امکان کر رہے تھے۔ چنانچہ سبطین آباد کی بھی تعمیر ہوئی اور محل میں بیت النجات نامی عزاخانہ بھی بنا۔ اسے قیصر باغ کے قصر العزا کی یادگار سمجھنا چاہئے۔ مدرسۂ سلطانیہ تو قائم ہی ہوا مگر چونکہ یہ شاہزادگان والا تبار کے لئے خاص تھا اس لئے مدرسۂ قیصریہ کے نام سے ایک اور مدرسہ بھی قائم ہوا اس مدرسۂ سلطانیہ سے بھی علماء لکھنؤ کے توقعات وابستہ رہے۔ پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی ادیبؔ کے کتب خانے میں دو مخطوطے ایک میں مجلد ہیں۔ ایک تو جناب مفتی صاحب کا مجموعہ مکاتیب، ریاحین الانشاء جسے مرحوم کے فرزند مولانا سید محمد صاحب نے مرتب کیا اور نجم العلماء سید ہدایت حسین نے لکھ کر ۹ رذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں تمام کیا۔ دوسرا ایک اور بے نامی مجموعہ ہے جس میں نجم العلماء سید ہدایت حسین کے مدرسۂ سلطانیہ میں تقرر کے لئے بعض امرائے شاہی کے نام زبدۃ العلماء مولانا سید علی نقی صاحب کے خطوط ہیں۔

تاریخ نے اپنے کو پھر ایک باردوہرایا۔ لکھنؤ فوجی طاقت سے تاراج کیا گیا تھا۔ مٹیا برج حکمت عملی سے تباہ ہوگیا۔ بادشاہ کی رحلت کے چند مہینوں کے اندر مئی ۱۸۸۷ء میں مدرسۂ سلطانیہ بند کردیا گیا اور شاہی عمارات کوکوڑیوں کے مول اس بہانے نیلام کیا گیا کہ عمارتوں اور اثاثے کی تقسیم مشکل ہوگی اور نقدی کی آسان۔ اس کا سراغ ملتا ہے کہ شاہزادۂ جہاندار قدر مرزا بیت النجات کی نجات کے لئے کوشاں تھے۔ اودھ کے رؤساء نے بھی تعاون کیا تھا۔ شہزادہ راجہ درگاہ پرشاد مہر کو لکھتے ہیں:

"فی الحال بتوجه کامل آنریبل مہاراجہ پرتاب نرائن سنگھ بہادر بہ حسن سعی خان بہادر چودھری نصرت علی بیگ مہاراجگان وراجگان وتعلقداران اودھ مبلغ پنج

ہزار روپیہ بنا بر شرکت چندۂ آمدہ
وغربت زدگان یعنی عموماً
باشندگان لکھنؤ وساکن الحال این
دیار را خیلے ممنون ساختہ۔"

یہ تحقیق نہ ہوسکا کہ عزاخانہ بچا بھی یا نہیں۔

یادداشت مدیر الواعظ

(مولانا سید حسن مہدی صاحب صدر الافاضل)

"ہمارے محترم دوست فاضل جلیل مولانا سید سبط محمد صاحب کا زیر نظر مقالہ تاریخی معلومات، مستند حوالہ جات سے لبریز ہے موصوف نے ایک اہم موضوع پر تحقیقی مقالہ قلمبند کیا ہے اور ناقابل انکار شواہد اپنے قول کی تائید میں پیش کئے۔ فاضل موصوف ایک جید عربی وفارسی داں ہیں انگریزی وہندی میں بھی دستگاہ رکھتے ہیں۔

زیر نظر مقالہ سے یہ توہّم نہ ہو کہ زمانہ شاہی میں عربی مدارس قائم ہونے سے قبل درس وتدریس علوم دینیہ نہیں ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مدرسۂ سلطانیہ قائم ہونے سے قبل علماء اعلام کے شریعت کدے اس عصر کے مدارس تھے سلسلۂ درس وتدریس برابر جاری تھا ہر عالم کا الگ الگ حلقۂ تلامذہ تھا نہ رجسٹر حاضری تھا نہ امتحان جس کے سبب سے طلاب علوم پورے جوش وخروش سے درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے لیکن جب سے مدارس قائم ہوئے نصاب کی باضابطہ تدوین ہوئی امتحانات سالانہ کا رواج ہوا رفتہ رفتہ ارباب کمال مفقود ہوتے گئے۔

اس مقالہ کے ص ۱۰/ کالم ۲/ پر مدرسۂ ایمانیہ کا بانی جناب سید ابوالحسن عرف ابو صاحب کو قرار دیا گیا ہے یہ اشتباہ ہے بلکہ مدرسہ ایمانیہ کو ملاذ العلماء مولانا ابوالحسن عرف بچھن صاحب نے حسب خواہش امیر الدولہ راجہ امیر حسن خاں صاحب قائم کیا تھا دونوں بزرگوں کے نام ایک ہونے کے سبب یہ اشتباہ ہوا ہے اور اسی اشتباہ کے سبب سے صفحہ ۱۱/ کالم ایک پر امیر الدولہ مرحوم کے مدرسہ قائم کرنے کو علاحدہ تحریر کیا۔ درحقیقت امیر الدولہ راجہ امیر حسن خاں صاحب طاب ثراہ کا بنا کردہ مدرسۂ ایمانیہ ہے اس کے مدرس اعلیٰ ملاذ العلماء مولانا ابوالحسن صاحب عرف بچھن صاحب قبلہ طاب ثراہ تھے جب مولانا ابوالحسن صاحب کا انتقال ہوگیا تو ان کے بڑے بھائی بحر العلوم مولانا محمد حسین صاحب عرف علّن صاحب مدرس اعلیٰ ہوئے لیکن ان کی عدم توجہی سے وہ مدرسہ ٹوٹ گیا اور جو رقم مدرسۂ ایمانیہ کے لئے ملتی تھی وہ امیر الدولہ کالج کی طرف منتقل ہوگئی۔ تفصیل کے لئے تاریخ محمود آباد مصنفہ علی حسن صاحب مرحوم حالات امیر الدولہ بہادر جلد اول ص ۱۷۳ کا مطالعہ کیا جائے۔"



مضمون کا دوسرا حصہ "مدرسۂ سلطانیہ کے محرک ومرغب جناب سید العلماء سید حسین صاحب علیین مکانؒ" انشاء اللہ آئندہ خاندان اجتہاد نمبر میں پیش کیا جائے گا۔　　(ادارہ)